سید معراج جامی
مدیر سہ ماہی 'سفیر اردو' لیوٹن

جوش۔۔۔۔ایک سہما بچہ۔ایک بگڑا نوجوان۔ ایک سرکش شاعر

میں جوش کا ایک قاری ہوں۔ اور ایسا قاری جس نے جوش کو اس کی بدنامی کے بعد سے پڑھا، اور جہاں تک طبیعت اجازت دیتی رہی پڑھتا رہا بعد میں وہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ مگر کب تک بالآخر مجھے دوبارہ جوش کو غور سے پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور چاہت بھی۔ اور اب آپ کے سامنے جوش پر میرا یہ مضمون حاضر ہے۔ اس مضمون کو میں نے اگرچہ اقتباسات سے ترتیب دیا ہے مگر جوش کے بارے میں اس مضمون میں جو بھی فیصلہ، دعویٰ یا اظہار ہے وہ میرا ہے۔ اس کی روشنی میں میرے مقالے کا عنوان آپ کے لیے یقیناً توجہ طلب ضرور ہوگا۔ اور اس عنوان کے تحت میں نے ایک الگ رخ سے جوش کا مطالعہ کیا ہے۔

جب میں نے ۱۹۵۳ء میں آنکھ کھولی تو جوش اس وقت تقریباً ۵۵ سال کے تھے۔ اور جب میرے شعور نے ۱۹۶۵ء میں آنکھیں کھولیں تو جوش صاحب تقریباً ستر سال کے ہو گئے تھے۔ ان ہی دنوں میرا جوش سے پہلا تعارف ان کی ایک نظم پروگرام کے ذریعے ہوا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جوش صاحب کی وہ نظم یہاں دہرادوں کہ یہ نظم مختصر ہونے کی

وجہ سے اس وقت پڑھی جا سکتی ہے ملاحظہ فرمائیے۔

اے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہو گا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

جن دنوں میں نے یہ نظم پڑھی میری عمر بارہ سال کی تھی، اور میں ادبی کتب و رسائل کی جانب مائل ہو رہا تھا۔ جوش کی اس نظم کو پڑھ کر جو لطف مجھے اس کچی عمر میں ملا اس کا اظہار اس پکی عمر میں مشکل ہو رہا ہے اور میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ بھی اس کیفیت کو سمجھ رہے ہوں گے۔ جب کسی شاعر کا کلام اچھا لگنے لگے تو مزید کلام کی جستجو ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے جوش کا مزید کلام ڈھونڈا تو مجھے جوش کی نظمیں ہی ملیں۔ غالب اور میر کی غزلوں نے پورے طور سے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا اس لیے میں ہر پسند آنے والے شاعر کی غزلیں ہی ڈھونڈتا تھا جوش کے سلسلے میں ناکامی ہوئی کہ میرے پاس اس وقت جتنے ادبی رسالے اور انتخاب تھے ان میں کسی میں بھی جوش کی غزلیں نہیں ملیں حتیٰ کہ درسی کتب میں بھی جوش کی نظمیں ہی ملیں. ایک نظم گھٹا یاد آ رہی ہے۔ اس نظم میں Imagery اپنے پورے جوبن کے

ساتھ رقص کرتی نظر آتی ہے۔

اٹھی گھٹا وہ رنگ و بو کا کارواں لیے ہوئے
جلو میں کائنات کی جوانیاں لیے ہوئے
لیے ہوئے ہوا کے نرم بازوں پہ بوستاں
ہوا کے نرم بازوں پہ بوستاں لیے ہوئے
ہوا میں اینڈتی ہوئی فضا میں جھومتی ہوئی
تحمل و شکیب کی تباہیاں لیے ہوئے
ادا و ناز و دلبری کی رنگ بینز چھاؤں میں
نئی نئی جوانیوں کی جھلکیاں لیے ہوئے
کدھر ہے جوش! بدلیاں رواں ہیں سوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشیے پہ سرخیاں لیے ہوئے

گھٹا کے علاوہ بھی میں نے جوش کی کئی نظمیں پڑھیں۔ تو اس قول پر ایمان لانا پڑا کہ واقعی الفاظ جوش کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ جوش کے پاس تھا۔ اور جوش کو بیان پر بے پناہ قدرت تھی۔ لہٰذا ذخیرہ الفاظ کے ساتھ بیان پر قدرت حاصل ہو تو پھر اشعار کا تسلسل بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کی نظموں کا تسلسل جھرنے کی مانند ہے۔ اور وہ بھی پرشور جھرنے کی مانند جس کی چھینٹیں نظارہ کرنے والے کو شرابور کر دیتی ہیں۔ جس سے ٹکرا کر گزرنے والی خنک تاب ہوائیں ناظر کو مست و بے خود کر دیتی ہیں. جس کی آواز کانوں میں گھنٹیاں بجانے لگتی ہیں. جہاں انسان پہروں کھڑا رہ سکتا ہے۔ یہ قدرت جوش کی نظموں میں ہے۔ غزل کے حوالے سے بات اس لئے نہیں کروں گا کہ جوش غزل کے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ آپ تمام حضرات بخوبی واقف ہیں کہ جوش غزل کے بے حد خلاف تھے۔ انھوں نے غزل کے ساتھ جو سلوک رکھا وہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ کوئی ماں اپنی سوتیلی اولاد سے وہ سلوک کیا کرے گی جو جوش نے

غزل کے ساتھ کیا۔ غزل کے خلاف ہی نہیں تھے بلکہ غزل کا مذاق بھی بہت اڑایا کرتے تھے۔ غزل کی بے پناہ مخالفت کے باوجود میں جوش کو اینٹی غزل نہیں کہوں گا کیونکہ جوش کا شعری سفر غزل سے شروع ہوا تھا۔ مگر۔۔۔۔ اُس مگر سے پہلے چلئے آپ کو جوش کی صرف دو غزلیں سناؤں جو مختصر ہیں مگر ان غزلوں میں رنگِ غزل کس قدر مکمل اور جامع ہے۔

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کش مکش دہر سے آزاد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا دل نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

☆☆☆

قدم انسان کا راہ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجوم کش مکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے
خلاف مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح
وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیر آ ہی جاتا ہے
ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر

مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے
شکایت کیوں اسے کہتے ہو یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیال عیش رفتہ آ ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآل گل مگر کیا زور فطرت کا
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

جوش کا غزل پر اعتراض یہ ہے کہ غزل میں بھان متی کا کنبہ جوڑا جاتا ہے۔ جبکہ جوش خیال مسلسل کے قائل ہی نہیں اس پر مائل بھی تھے اور (بقول ان کے) اسی خرابی کے باعث وہ غزل سے متنفر ہوگئے۔ ایسا کیوں ہوا اس کی بھی ایک وجہ ہے جوش کا غزل سے فرار اور نظم کی پرستش اس لئے تھی کہ جوش میں اظہار بیان کی قوت بہت زیادہ تھی۔ مشاہدہ کمال کا تھا۔ الفاظ کا ذخیرہ بہت تھا۔ وہ کسی شے پر اپنی نظریں گاڑ دیتے تو تحت الثریٰ کی خبر لاتے ایک ایک جزئیات پر بڑی گہری نظر ڈالتے پھر جو طبیعت رواں ہوتی تو پتہ نہیں کس مرحلے پر جا کر اشعار کا سلسلہ تھمتا اور یوں الفاظ کا دریا اس موضوع کو جل تھل کر دیتا۔ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ غزل کے معاملے میں وہ بھی کورے ہی رہے اردو شاعری میں نظموں کے حوالے سے جوش اور اقبال کا جو حصہ ہے وہ اس قدر وسیع اور وقیع ہے کہ کوئی کافر ان کی خدمات کو سمیٹنا چاہے تو سمیٹ نہ پائے گا۔

اب اس تمہید کے بعد میں اپنے اصل موضوع کی جانب آتا ہوں۔ میرے مقالے کا عنوان جوش کی زندگی کی تین مختلف مدارج ہیں۔ ایک سہا بچہ دوسرا بگڑا نوجوان، تیسرا سرکش شاعر، سہا بچہ کے بارے میں انور خلیل کو جو روزنامہ حریت کے سابق ایڈیٹر رہ چکے ہیں جوش نے فیڈرل بی ایریا کراچی میں اپنی رہائش گاہ پر انٹرویو دیتے ہوئے بتایا، ''میرے والد بشیر احمد خان بشیر بڑے سخت گیر انسان تھے لہٰذا میری ابتدائی تربیت انتہائی سخت گیری کے ساتھ ہوئی۔ پٹھان ہونے کے ناطے خاندان کے مردوں میں جو کرختگی ہونی چاہیئے وہ میرے والد میں بدرجہ اتم موجود تھی اگرچہ خود پڑھے لکھے تھے اور شاعر بھی اس کے باوجود

میری تعلیم روایتی انداز میں ہوئی۔ جبکہ طرفہ تماشہ یہ کہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار تھا۔ کم عمری میں تعلیم کے شوق نے اتنا زور مارا کہ میں نے حویلی کی دیواروں پر تعلیم کا بھوکا۔ شبیر۔ تعلیم کا بھکاری۔ شبیر لکھ دیا''۔ جوش کے والد دراصل جوش کو لکھنو بھیجنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ لکھنو کے غیر تعلیمی و ادبی ماحول سے خوب واقف تھے اور اس سے کہیں زیادہ انھیں اپنے بیٹے کی رنگینیوں کا اندازہ بھی خوب تھا۔ لہٰذا انھوں نے جوش کو لکھنو کے بجائے سیتاپور بھیج دیا۔

نوجوانی میں شاعری کا شوق چڑھا تو والد گرامی نے جوش پر پابندی لگا دی۔ سختی اس قدر کہ جاسوس مقرر تھے۔ ذرا سوچئے باپ صاحب دیوان شاعر، گھر پر شاعری کے چرچے ہوں۔ مشاعرے ہوں دادا نواب محمد احمد خان احمدؔ صاحب تخلص ہی نہیں صاحب دیوان بھی۔ پر دادا نواب فقیر محمد گویاؔ صاحب دیوان شاعر ننہیال میں بھی شاعری کا دور دورہ تھا۔ جوش کی دادی کا بھی شعر و سخن سے خصوصی تعلق تھا۔ خاندان کی خواتین بھی شاعری کا ذوق رکھتی تھیں اور شعر کے حسن و قبح کی نباض تھیں۔ خود جوش کے پرائیویٹ ٹیوٹر اچھے شعری مذاق کے حامل اور شاعر تھے۔ ان حالات میں جوش پر شعر گوئی کی قدغن اس لئے لگانا کہ بقول جوش کے والد ''شاعری سے نحوست آتی ہے'' اگرچہ قابل فہم نہیں مگر حقیقت پر مبنی ہے۔ بہرحال جوش اس موقع پر بھی اپنی ضد پر قائم رہے اور کامیاب ہوئے۔ اس حد تک کہ ان کے والد صاحب نے مشہور اور کہنہ مشق شاعر عزیز لکھنوی سے مشورہ سخن کی اجازت دیدی۔

ابتدا میں جوش کی ابتدائی تعلیم اور تربیت پر جو سخت گیری برتی جاتی تھی اور جس سے وہ ہر وقت خائف و ترساں رہتے تھے اس کے نتیجے میں ان کے مزاج میں چڑچڑاپن اور غصہ بہت آ گیا تھا۔ اور یہ کیفیت لڑکپن سے جو طبیعت میں داخل ہوئی تو اس نے اس خطرناک حد تک اثر ڈالا کہ انھوں نے کئی ایسی حرکات کیں جن سے اُن کی عملی زندگی ہی نہیں بلکہ مذہبی زندگی تک متاثر ہوئی اور ایک وقت یہ بھی آیا کہ جہاں جوش کی تعریف ہوتی وہیں ان کی تکفیر بھی کی جاتی۔ یہ پس منظر تھا ان واقعات کا جو جوش کے والد نے جوش کے ساتھ کیا

یعنی باپ نے ان کی تشہیر پر عاق کیا لیکن پھر چھ ماہ کے بعد ان کے استقلال اور ان کی سیر چشمی سے متاثر ہو کر عاق نامہ واپس لے لیا۔ انہیں باہر جانے پر شروع میں پابندی لگائی اور آخر کار اس کی اجازت دیدی۔ شاعری پر قدغن لگائی اور بعد ازاں خود قدغن اٹھالی۔

بچپن کی ان ناکامیوں اور کامیابیوں نے جوش کے کردار کی تشکیل میں زبردست نفسیاتی اثر ڈالا چنانچہ جوش ایک نفسیاتی مریض بن گئے۔

بچپن میں سہما ہوا بچہ جب لڑکپن میں داخل ہوا تو اس کے اندر شرافت و بغاوت کی ایک جنگ جاری تھی اور یہ جنگ ہر دو محاذ پر بڑی تیزی سے رخ بدلتی رہی۔ اس جنگ کے سائے میں جوش لڑکپن سے جوانی کی حد میں داخل ہوگئے۔ جنگ برابر جاری رہی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شرافت نے بغاوت کو کچل دیا اور جوش مولانا جوش کہلانے لگے۔ داڑھی ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے پانچ چھ سال انتہائی زہد و تقویٰ میں گزارے۔ انور خلیل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

۱۹۱۸ء (جب جوش بیس سال کے تھے) میں مجھ پر تصوف کا ایک ایسا دور آیا تھا کہ اس عرصے میں، میں ایسی طویل الرکوع و سجود نمازیں پڑھتا تھا کہ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے بھی شاید ہی پڑھی ہوں۔ تصوف کا مجھ پر اتنا غلبہ تھا کہ میں نے چارپائی پر لیٹنا، اچھے کپڑے پہننا اور حد تو یہ ہے کہ گوشت کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میری سب سے پہلی تصنیف 'روح ادب' پر یہ اثر غالب ہے اس زمانے میں اکبر الہ آبادی نے پیش گوئی کی تھی کہ میں درویش ہو جاؤں گا۔ میں درویش تو نہ ہو سکا البتہ میرا پرانا ملازم درویش ہو گیا''۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی نے جوش کی تصنیف روح ادب پر سب سے پہلے رائے دیتے ہوئے لکھا:

''مصور جذبات شبیر حسن خاں جوش رئیس زادے ہیں۔ شرافت اور وضع داری کے نشان ان میں بہت نمایاں ہیں۔ حقائق عالم اور معرفت باری تعالیٰ میں ان کے اشعار نہایت بلیغ و دل آویز ہوتے ہیں اور یہ ان کا فطری جوہر ہے۔

آپ کی نثر بھی خوب ہے کیوں نہ ہو آپ اہل دل بھی ہیں اہل زبان بھی۔ میری خوش نصیبی ہوگی کہ میرے بعد آپ ایسے یاد کرنے والے باقی رہیں۔ آپ کا شعر

فنا ہو جا، جھلک اٹھے گا سینہ شمع عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ غافل داغ ہستی ہے

عجیب شعر ہے۔ ''داغ ہستی'' کے متعلق بہت کچھ خیالات ذہن میں ہیں جنھیں لکھ نہیں سکتا۔ اس شعر نے روح کو تازہ کر دیا۔

اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک ازلی پرتو پڑ رہا ہے جس کے لئے صرف شعر ہی کافی نہیں۔ آپ کو اپنی قدر کرنا چاہیئے آپ بہت کچھ ہو سکتے ہیں۔ کوشش کیجیئے کہ نماز میں لذت ملے، اور علم باطن حاصل کیجیئے۔

یہ پُر جوش طبیعت ہونہار ہے۔ نثر میں ندرت تشبیہات سے آپ کے ذہن کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ خدا مبارک کرے کاش کسی وقت میں آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔

آپ کی صحبت روحانی غذا ہے۔ عبرت، معرفت، بے خودی جوش روحانی سے آپ کے اشعار لبریز ہوتے ہیں آپ نے چشم بدور عمدہ طرز بیان پایا ہے۔ باسی سوسائٹی میں رہ کر ایسے خیالات عالی حیرت افزا ہیں۔

مجھے آپ سے روحانی محبت ہے۔ آپ کے تصور سے دل کو فرحت ہوتی ہے۔ خدا آپ کو زندہ اور نرم معنی کو آپ کی ذات سے روشن رکھے''۔ اکبرالہ آبادی

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یہ جوش تھے۔ جنہوں نے چند سال اپنے چہرے پر ڈاڑھی بھی سجائی تھی عبادت و ریاضت میں عابد شب زندہ دار کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ مگر ان کے مراجعت آزری کے سلسلے میں جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ بھی اور وہ واقعہ بھی جو ان کے تبدیلی عقیدہ پر بیان کیا جاتا ہے دونوں واقعوں کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں وہ واقعہ جو عقیدے کی تبدیلی کا ہے اسے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ 'جوش' کے اب وجد سنی تھے لیکن جوش نے دادی کے عقیدہ شیعت کو قبول کرتے ہوئے ۱۹۰۷ء میں اپنا نام بھی تبدیل کر لیا۔

دوسرا واقعہ بقول جوش کے صاحبزادے سجاد حیدر، جوش صاحب جوانی میں صوم و صلواۃ کے بڑے پابند تھے زمین پر سوتے تھے۔ ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی پھر یکا یک تبدیلی

آئی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ دہریئے بن گئے۔ تبدیلی کی جو وجہ بتائی وہ یہ کہ بس ایک روز ایک بڑی بی کو دیکھا جو سر پر بہت بڑا بوجھ اٹھائے جا رہی تھی اتنی ناتواں تھی کہ اس کو چلنا محال تھا۔ بس وہیں جوش صاحب اڑ گئے کہ اے خدا اگر تو ہے تو اتنا قہار کیوں ہے اس بے چاری کا یا تو کوئی بوجھ بانٹنے والا ہوتا یا یہ مرگئی ہوتی۔ اس پر یہ ستم کیوں بس خدا پر سے یقین اٹھ گیا۔

میں نے ان دونوں واقعوں سے پہلے کہا کہ ان دونوں واقعوں کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں۔ جوش کے دہریہ ہو جانے اور عقیدہ تبدیل کرنے کے عوامل کچھ اور تھے جنھیں فساد خلق کی بناء پر ظاہر نہیں کیا جا رہا ہے مگر در پردہ جانتے سب ہی ہیں۔ جوش علم و فضل میں ماہر مانے جاتے تھے۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ بھی وسیع تھا اس کے باوجود صرف ایک معذور بوڑھیا کو عالم مشقت میں دیکھ کر خدا سے برگشتہ ہو گئے۔ کیا جوش نے اس واقعے سے قبل کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا تھا جس پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے ہوں۔ یا چلنے پھرنے سے محتاج ہونے کے باوجود محنت و مشقت کر رہا ہو۔ ایسی عورتوں کو نہیں دیکھا جو عالم جوانی میں معصوم بچوں کے ساتھ بیوگی میں زندگی کی سزا کاٹ رہی ہوں۔ جن پر کوئی رحم کی نظریں ڈالنے پر تیار نہیں اور اگر کوئی دیکھتا بھی ہے تو ہوس کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کیا جوش اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ دنیا مکافات عمل ہے۔

جوش کو چھوڑیے آپ تمام حضرات میں سے کون ایسا ہے جس نے انسانوں کی ناقابل برداشت مظلومیت نہیں دیکھی؟ انسانوں پر انسانوں کے ہاتھوں ظلم و بربریت کا تماشہ نہیں دیکھا۔ ایک بہت مشہور واقعہ بیان کرتا ہوں جسے تمثیلاً پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

ایک دن اللہ تعالیٰ نے عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا' تم نے اربوں کھربوں جانداروں کی روح قبض کی ہے کیا کسی کی روح قبض کرتے ہوئے تم کو ترس بھی آیا' عزرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں رب العزت جب ایک عورت سیلاب میں بہہ رہی تھی اور اس کے سینے سے اس کا شیر خوار بچہ چمٹا دودھ پی رہا تھا کہ مجھے آپ نے عورت کی روح قبض کرنے کا حکم دیا تو مجھے آپ کے اس حکم پر حیرت اور اس شیر خوار پر بہت ترس آیا۔

کیا یہ واقعہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے وجود سے منکر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ یا یہ کہا جائے کے منکر ہونے کے لئے حق یقین کی نہیں عین یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔

بات یہ نہیں ہے کہ انسان محض کسی مظلوم عورت کو مشقت کرتا دیکھ کر دہریہ ہو جائے۔ دہریہ ہو جانا بھی آسان نہیں ہوتا بالکل اسی طرح جس طرح۔۔۔لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا۔ دراصل جوش بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک جس تضادات سے گزرے ہیں ان تضادات نے ان کی زندگی کو ایک چیستاں بنا دیا تھا اور اس کے چیستاں کو کسی حد تک سمجھنے کے لئے روح ادب کے دیباچے سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں سماعت فرمایئے۔

''اس کتاب میں میرا نو برس کی عمر سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا کلام ہے۔ میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ نو برس کی عمر سے شعر نے مجھ سے اپنے کو کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے اس وقت کسی علیحدہ گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک ناواقف ہوں۔ شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب مشغلہ تھا کہ ایک اونچی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جو جی میں آتا تھا۔ اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا۔ اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا، اسے میں، بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بے چارا چیخیں مار کر رونے لگتا تھا اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کندھے پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا تھا اور میرے مزاج کی وہی بنیادی تختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ وترش لہجہ بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نقاد میری لہجے کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔

میں بچپن میں بلا کا شعلہ نوا تھا۔ غیظ وغضب کا یہ عالم تھا کہ ایک ذرا سی خلاف

مزاج بات پر میرے ہر بن منہ سے چنگاریاں سی نکلنے لگتی تھی۔ ہر چند تیس فی صد زمانے کی گردش اور ستر فی صد تفکر اور تدبُّر اور محبت نے میرے مزاج کو اب اس قدر بدل دیا ہے کہ مجھے اپنی اس قلب ماہیت پر خود حیرت ہوتی ہے۔ پہلے صرف حیرت ہوتی تھی اور اب ایک تحسین آمیز خوش گوار حیرت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس قلب ماہیت کے باوجود حماقت و عبادت پر مجھے آج بھی غصہ اور گاہ گاہ شدید غصہ آ جاتا ہے۔ اور یہی وہ غصہ ہے جو میری سیاسی نظموں میں جیسا کہ بیان کر چکا ہوں جھلکا کرتا ہے۔ جانتا اور خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس شخص میں جتنی مقدار غیظ وغضب کی ہوتی ہے اسی نسبت سے اس کی ذات میں حکمت اور بصیرت کی کمی ہوتی ہے۔

نیز اس زمانے میں یادیں بخیر ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت سختی کے ساتھ پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلاتا اور کمرہ بند کر لیتا تھا اور گھنٹوں رکوع وسجود میں کھویا رہتا تھا۔ اس دور میں، میں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ چارپائی پر لیٹنا اور گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ ایک مشہور سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیت بھی کر لی تھی۔ اور وہ چیز جسے صوفیائے کرام تجلیات کہتے ہیں میرے قلب کو حاصل ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر میرے آنسو نکل آتے تھے اور بالخصوص گریہ نیم شبی اور آہ سحری کے وقت تو ایسا محسوس ہوتا گویا میرا دل بہہ رہا ہے۔ اور میرا تمام وجود فضائے نیل گوں میں اڑ رہا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود دہشت واضطراب کے ساتھ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر کوئی خطرناک کمانی کھل رہی ہے جو آخر کار مجھ سے میری اس دنیائے لطافت کو چھین لے گی چنانچہ وقت گذرتا گیا اور کمانی کھلتی چلی گئی اور کچھ مدت کے بعد مجھ میں ایک ہلکا باغیانہ میلان پیدا ہو گیا اور اب میں اس منزل میں آ گیا ہوں جہاں ہر قدیم اعتقاد اور ہر پارینہ روایت پر اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے اور اعتراضات بھی تمسخر انگیز واہانت آمیز۔

جب میرے خیالات واقوال کا کارواں اس راستے پر آہستہ آہستہ گامزن ہونے لگا

تو میرے مرحوم باپ کو سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ میں گمراہ ہو جاؤں گا انھوں نے مجھے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ سمجھانا اور ایک مدت تک سمجھانے سے تنگ آ کر آخر کار دھمکانا شروع کر دیا۔ مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور آبائی عقائد و روایات سے میری بغاوت بڑھتی ہی چلی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے باپ نے وصیت نامہ تحریر فرما کر میرے پاس بھیج دیا کہ اگر اب بھی میں اپنی ضد پر قائم رہوں گا تو وہ اس وصیت نامے کو جس میں انھوں نے مجھے جائداد سے محروم کر کے میرے نام صرف سو روپے کا ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا تھا۔ جج کے آہنی صندوق میں داخل کر کے میرے مستقبل کو زندان محرومی میں ہمیشہ کے واسطے مقفل فرما دیں گے۔ لیکن مجھ پر اس کا بھی مطلق اثر نہیں ہوا۔

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں کیونکہ یہ چیزیں ناکامی اور انفصالیت سے پیدا پیدا ہوتی ہیں۔ اور میں ان چیزوں سے شاید ہی دوچار ہوا ہوں۔''

اس اقتباس سے آپ نے جوش کی طبیعت' فطرت اور افکار کا بخوبی اندازہ لگالیا ہوگا۔ میں نے جوش کے اس دیباچے سے 'انور خلیل' نور الصباح بیگم' اور شمیم اکرام الحق کو دیے گئے انٹرویو سے اور لسان العصر اکبر الہ آبادی کی روح ادب پر پہلی رائے سے جو نتیجہ اخذ کیا اسے اپنے مقالے کا عنوان بنا دیا اور اس مقالے میں میں نے ان تمام تحریروں سے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جوش کا بچپن جس خوف میں گزرا اس نے جوش کے کردار میں بغاوت کا عنصر پیدا کر دیا۔ لڑکپن میں سنبھلے تو پہلا شعری مجموعہ روح ادب تخلیق کر ڈالا اور اس میں جوش کا ایسا معیاری اور مقفی کلام تھا کہ اکبر الہ آبادی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گئے شرر لکھنوی نے روح ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ: 'ایسی حکیمانہ اور عارفانہ شاعری اور اس قدر خوبیاں محض آپ کی خداداد طبیعت کا نتیجہ ہے'۔

مگر بقول جوش، جوانی میں پہنچے تو زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ ذہن میں باغیانہ خیالات بھی آنے شروع ہو گئے۔ دراصل بچپن کے خوف نے جس بغاوت کا علم جوانی میں

بلند کیا وہ لڑکپن میں اس لئے بلند نہیں ہو سکا کہ خیر و شر کی جنگ مرد اس وقت ہی جیت سکتا ہے جب وہ معصوم ہو۔ اور لڑکپن کا دور بھی معصومیت کا دور ہوتا ہے مگر جوانی میں ہر سانس کے ساتھ نئے خیالات ذہن میں آتے ہیں اور وہ نئے خیالات خیر یا شر کسی بھی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ بچپن کی مظلومیت اور لڑکپن کی سعادت کے بعد جوانی میں عجز انکساری کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا جوش سرکش ہو گئے اور یہ سرکشی ادب ہی میں نہیں مذہب میں بھی اس قدر بڑھ گئی کہ بے شمار ایسی رباعیات کہہ ڈالیں جو اللہ تعالیٰ کے شان کے منافی ہیں جوانی کی یہ سرکش روش جوش کے مرتے دم تک ساتھ رہی بلکہ جوش کے ساتھ ہی گئی۔

ان حالات کے تناظر میں جوش کا تجزیہ سب نے اپنے اپنے طور پر کیا۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں نے اپنی پسند کے موضوع کے آئینے میں جوش کو دیکھا۔ جوش نے اپنے لیے جو آئینہ ہمیں دیا اسے ہماری گرد کدورت نے دھندلا کر دیا۔ اور اس قدر دھندلا کر دیا کہ اس میں جوش کی صورت تو کیا نظر آئے گی ہم خود بھی نظر نہیں آئے۔

آخر میں آخری بات اور وہ یہ جوش مسلماں تھے یا دہریے، جوش شاعر شباب تھے یا شاعر انقلاب، جوش مظلوم تھے یا ظالم' جوش انسان تھے یا آدمی' جوش انسانیت کے علمبردار تھے یا جنسیات کے پرستار' جوش کیا تھے جوش کیا نہیں تھے' ان کا مقام ان کا مرتبہ ان کی اچھائیاں ان کی برائیاں' ادب میں ان کے مقام کا تعین کہ جوش بیسویں صدی کے عظیم شاعر تھے مفکر تھے' یا حق گو تھے' ان سب باتوں کا فیصلہ نہ آج ہوگا اور نہ کل بلکہ اس بات کا فیصلہ تو اس صدی میں بھی نہیں ہوگا بلکہ اس بات کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب جوش کے سارے دوست اور دشمن مر چکے ہونگے۔

(جوش عالمی سمینار لندن میں پڑھا گیا مقالہ)

☆☆☆